© rasailojaraid.com

کے خوف پر مبنی ہے۔ اِس سے یہود - مسیحی تعلقات جو بتدریج بہتر ہوتے جا رہے تھے، ان میں ایک بار پھر رخنہ پیدا ہو گیا ہے۔ مقامی مسیحی رہنماؤں کا موقف یہ ہے کہ وہ اس مسئلے کی حساسیّت سے آگاہ ہیں اور اسی لیے تبشیری سرگرمیوں میں شامل نہیں ہوتے۔ یروشلم کے ایک پروٹسٹنٹ چرچ کے پادری جناب پال ورجر کا کہنا ہے کہ "ہم ہر خدمت کے لیے حاضر ہیں، مگر کسی کے مذہب پر چھاپہ مارنا ہمیں منظور نہیں۔ میرے خیال میں اگر ہم نے ایسی کسی حرکت کا ارتکاب کیا تو ہمیں یہاں سے باہر پھینک دیا جائے گا، مجھے حیرت ہے کہ مسودہ قانون پیش کرنے والے خوف کا شکار کیوں ہیں؟"

وزارتِ مذہبی اُمور کے یُوری مور نے جو ایسے مسائل پر نظر رکھتے ہیں، کہا ہے کہ "بعض چرچ مسئلے کی حسّاس نوعیت کا خیال نہیں رکھتے" اور روس اور ایتھوپیا سے آنے والے یہودیوں کو حلقۂ مسیحیت میں داخل کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ یُوری مور نے مزید کہا کہ "میں جانتا ہوں کہ یہ مسوّدۂ قانون پارلیمنٹ میں کیوں پیش کیا گیا ہے، اس لیے کہ اسرائیل میں مبشّرین سرگرم عمل ہیں۔ مغربی چرچوں کو یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اسرائیل میں تبشیری سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکتے۔"

"مشرق کس طرح فتح کیا گیا ہے۔"

[پاکستان میں مغرب زدگی کی لہر شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ ردِ عمل کی کئی جہات ہیں۔ انگریزی روزنامہ "نیشن" (اسلام آباد) نے کاشف اکرم نون کا ایک مضمونچہ شائع کیا ہے۔ یہ مضمونچہ "عالمِ اسلام اور عیسائیت" کے عمومی مزاج سے ذراہٹ کر ہے، تاہم وطنِ عزیز کی سوچوں سے آگاہ رہنے کے لیے اِس کا ترجمہ ذیل میں مؤقر معاصر اور مضمون نگار کے شکریے کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے۔ انگریزی سے اُردو ترجمہ جناب شاہد فاروق نے کیا ہے۔ مدیر]

"مسیح کا واسطہ ہے --- رک جاؤ!" میں نے یہ الفاظ اس وقت سنے جب خریداری میں مصروف تھا۔ ان الفاظ نے مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا، وہ اس لیے کہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سٹورز — K. Mart (کے-مارٹ) یا J.C.Penny's (جے-سی-پینیز) میں خریداری نہیں کر رہا تھا، بلکہ یہ یہاں پاکستان کی بات ہے۔ نوجوان جوڑا جسے میں نے باتیں کرتے ہوئے سنا، کسی مسئلے پر بحث کر رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا، کیونکہ مرد اور عورت میں تمیز کرنے کے لیے مجھے ایسا کرنا پڑا تھا۔ آہ! لمبے لمبے بال اور چھدے ہوئے کان۔ مجھے فرانسیسی طرز کی ڈاڑھی دکھائی دی اور میں نے محاورتاً سکون کا سانس لیا۔ میرا کسی کی بات کو سن لینا، ایک چھوٹا سا معمولی واقعہ معلوم ہوتا ہے، یہ اتنا اہم بھی نہیں کہ اسے اخبار میں جگہ دی جائے، لیکن اس بظاہر معمولی نظر آنے والے واقعہ نے مجھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غور کرنے پر مجبور کر دیا۔ ہم کس طرف بڑھ رہے ہیں؟ بحیثیتِ فرد، بحیثیتِ معاشرہ اور بحیثیتِ تہذیب۔ (اگر ہمیں کسی تہذیب سے تعلق رکھنے کا دعویٰ ہے تو ـــ) سٹور میں اُس خاتون نے جو الفاظ استعمال کیے وہ قسم کھانے کا ایک مخصوص امریکی انداز ہے جس کی اجازت، اگرچہ مغربی طور طریقوں کے مطابق سرکاری طور پر نہیں دی جاتی، لیکن وہ فلموں میں اِس سے بکثرت کام لیتے ہیں۔ محض یہ تصور ہی ایک مغربی انداز ہے۔ افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے شہروں میں رہنے والے نوجوانوں کی روز مرہ بول چال میں یہ بتدریج داخل ہوتا جا رہا ہے۔

مانا کہ دنیا ایک عالمی گاؤں بنتی جا رہی ہے، لیکن ہمیں گاؤں کے مسخروں یا بھانڈوں میں بدل دیا گیا ہے جو ہر اس چیز کی نقالی کرتے ہیں جو اُنہیں میڈیا سیٹلائیٹ کے ذریعے سکھائی جاتی ہے۔ ہم نے اُس حقیقت سے تعلق منقطع کر لیا ہے جو ہماری اپنی ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو جعلی جدیدیت کی بھول بھلیوں میں گم کر لیا ہے۔

ہماری نوجوان نسل مغرب کی نوجوان نسل جیسا بننے کی خواہشمند ہے۔ وہ اُن کے اطوار حتیٰ کہ ان کی اقدار کی نقل کرنے لگی ہے۔ مغرب کی نقالی میں پیچھے رہ جانا اس کے لیے ایک ڈراؤنا خواب بن گیا ہے، اور نوجوان نسل کو خوف ہے کہ کہیں وہ پس ماندہ نہ رہ جائے۔ جدید بننا مغربی بننے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ ہم بچوں کی کہانیوں کے کردار بانسری بجانے والے (Pied Piper) کی دُھن پر ناچ رہے ہیں، اور ہم (ایسا کرنے والے) گاؤں کے بچے بھی نہیں، بلکہ وہ چوہے ہیں کہ طاقِ نسیاں کا گلدستہ بن جانا جن کا مقدّر ہے۔

ہمارے کھاتے پیتے تعلیم یافتہ شہری نوجوان اپنے مغربی پہناوے کے عادی ہیں اور دھوتی پہننے کے تصور سے ہی وہ بے ہوش ہونے لگتے ہیں، حالانکہ دھوتی اتنی ہی اچھی یا بری ہے جتنا کہ مغربی پہناوا۔ دھوتی میں اضافی صفت یہ ہے کہ یہ تھوڑی ہوادار ہوتی ہے۔ میں دھوتی کے حق میں دلائل نہیں دے رہا، بلکہ اصل بات وہ نفرت ہے جس کا اظہار ہمارے آباء و اجداد کے لباس کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ یہ نفرت قابلِ اعتراض ہے، آپ اپنی پسند کا لباس پہنتے رہیں، لیکن اس آدمی کو حقارت سے نہ دیکھیں جس نے اپنا آبائی لباس پہن رکھا ہو۔ یہ بات صرف شناخت کے بحران کی آئینہ دار ہے۔

لمبے بال رکھنا اور ان کو چُٹیا کی شکل میں باندھنا، اور ایک کان میں چھید کرنا ان دنوں "مقامی" باتیں ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کے لیے (زیادہ کم عمر لوگوں کے لیے نہیں) ایک خبر یہ ہے کہ ہمارے دیہات میں آزاد منش نوجوان اس حُلیے کے حامی ہیں، لیکن اُن کے پاس نقالی کرنے کے لیے اپنا "رانجھا" ہے جو اپنی محبت کی مہم جوئی میں جوگی بن گیا تھا۔ اس نے لمبے لمبے بال رکھ لیے تھے اور کانوں میں بالے ڈالنے شروع کر دیے تھے۔ اگر آپ لمبے بال رکھنا چاہیں (جوؤں کی وجہ سے جن کا مشورہ نہیں دیا جا سکتا) تو بون جووی کے بجائے اپنی دھرتی کے بیٹوں کی نقالی کریں، لیکن افسوس کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے چارے "رانجھے" کو کوئی نہیں جانتا۔

مغرب کی نقالی صرف حلیے تک ہی محدود نہیں، بلکہ اس نے ہماری زبان کو بھی متاثر کیا ہے۔ ایف - ایم - ۱۰۰ پر اناؤنسروں کا بھاری لہجے میں اردو بولنے کا انداز نہایت مضحکہ خیز ہے۔ یہ انگریزی ہوتی ہے جس میں اُردو الفاظ ادھر ادھر ٹانک دیے جاتے ہیں۔ یہ حالت ہمارے ثقافتی افلاس کی آئینہ دار ہے۔ از حد معذرت کے ساتھ کہ زبان میں اِس ملاوٹ سے مولوی عبدالحق کی روح یقیناً بے چین ہو گی۔ (ویسے وہ ہیں کون؟) ایف - ایم کا تصور ہی امریکی ہے، اس لیے اپنی زبان کا بیڑہ غرق کرنے کی بجائے اِسے انگریزی پروگرام کے طور پر ہی کیوں نہ اپنایا جائے!

ہماری فلمیں دیکھیں۔ جن کی حیثیت گھٹیا نقلوں سے زیادہ نہیں اور نقل بھی ہالی وڈ کی نہیں، بلکہ بالی وڈ کی۔ موسیقی کو تو رہنے دیں وہ تو گانوں کے الفاظ تک تبدیل کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔ موسیقی کی بات کریں تو ہمارے شہری بالائی طبقوں میں نصرت فتح علی خان کی غیر معمولی مقبولیت کسی حد تک پُراسرار ہے۔ چند سال پہلے تک خان صاحب ایک غیر معروف فنکار تھے۔ فیصل آباد کی "رحمت گراموفون کمپنی" ان کے کیسٹ بازار میں لاتی تھی۔ وہ کسی گمنام شاعر باری نظامی کا صوفیانہ کلام گاتے تھے، لیکن ہمارے نوجوان کھاتے پیتے شہری لوگوں میں سے کسی نے بھی اُن کی خوبیوں کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھا۔ ان کی آواز کے نام نہاد جادو نے ہمارے کانوں پر کوئی اثر نہ کیا۔ جس دن سے پیٹر گیبریل نے عجیب و غریب آوازوں والی سارنگیوں اور طبلوں کی جگہ اُن کے سامنے الیکٹرانک آلاتِ موسیقی لا رکھے تو دیکھتے ہی دیکھتے خان صاحب کے ڈنکے بجنے لگے، لیکن انہیں مقبولیت اُس وقت ملی جب وہ مغرب میں مقبول ہو چکے تھے۔ اُن کی موسیقی ہم تک "پیٹر خان صاحب" کے ذریعے پہنچی ہے۔ خان صاحب کے شہرت کی بلندی پر پہنچنے کے پیچھے ایک سادہ سی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے کان مغربی ڈھولوں کی تال سننے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہمارے احساسات اور جمالیاتی ذوق مغربی ہو گئے ہیں اور مجھے ندامت سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ذہن غلام بن گئے ہیں۔

مضمون یہاں ختم کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ آپ کو ایک رجعت پسند کی بے معنی باتیں لگی ہوں، لیکن جو کچھ میرے آس پاس ہو رہا ہے وہ پریشان کن ہے۔ اس وقت ایک ردِعمل کی ضرورت ہے، کیونکہ تاریخ نگار ٹائن بی کہتا ہے کہ وہ تہذیبیں جو چیلنج کا جواب دینے میں ناکام ہو جاتی ہیں، تاریخ کی کتابوں کا حصّہ بن جاتی ہیں۔ ہمیں اپنے اوپر فخر نہیں رہا، وہ فخر جو روایات میں گندھا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم زندہ رہ سکیں گے؟ اور اِس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ کیا ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں؟ اس کا جواب آپ کے پاس ہے۔

© rasailojaraid.com